

## اُردو میں معاصر تحقیق کے مسائل اور معیار کی بازیافت

| نمبر شمار | مصنف               | ادارہ ہذا                                   |
|-----------|--------------------|---|
| 1         | محمد حناور نواز شش | شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان |

**Abstract:** Urdu research is facing various problems at present and these problems are actually more in institutional level research. There is a lot of repetition in the topics that students choose for research, mainly because the topics are made up for serving the purpose. The themes and topics of research are not based on any philosophical thought process. This paper tried to highlight these issues. At the same time, students' unfamiliarity with research principles and methods has also been made a topic. In order to retrieve the quality of the research in Urdu, two different articles and examples of their topics, content, methods and discussions are presented, including "Muhammad Hussain Azad as a Researcher" by Qazi Abdul Wudud and "History of Urdu Literature till 1700: In the light of Research" by Abrar Abdul Salam. Writer of this research paper is of the view that at least above mentioned two articles should be taught to the students before they are forced into the field of practical research.

**Keywords:** Research, Contemporary, Principles, Quality, Problems, Issues.

**Email:** khawarnawazish@bzu.edu.pk

عصری منظر نامے پر اُردو تنقید اور تحقیق سے کہیں زیادہ اُردو تخلیق کی حیثیت معتبر ہے۔ اس وقت اردو میں لکھی جانے والی نظم اور فکشن کو دنیا کے کسی بھی خطے کی بڑی شاعری اور فکشن کے مقابلے میں باسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اگر ان کی طرف نظر ڈالیں تو وہ ماضی سے کہیں زیادہ دستیاب ہیں۔ ماضی میں جن ماخذات کی تلاش میں محققین کو مختلف اداروں اور شہروں کی لائبریریوں کے کئی دورے کرنے پڑتے تھے ان میں سے بیشتر لائبریریوں کے مکمل ذخیرے آن لائن دستیاب ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کی لائبریریوں اور کتب تک بھی آج کے دور میں رسائی آسان ہے۔ اسی طرح جو بھی نئی کتاب چھپتی ہے وہ گھر بیٹھے منگوائی جا سکتی ہے۔ ادبی رسائل و جرائد کا غنم ہنگامہ ہونے اور دیگر طباعتی مسائل کی وجہ سے اب آن لائن ہو چکے ہیں۔ جامعہ سے شائع ہونے والے تحقیقی مجلات بھی اپنی اپنی ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ غور کریں تو متعلقہ مواد تلاش کرنے کے لیے بھی اب ایسے ایسے سرچ انجنز اور ٹولز دستیاب ہیں جنہوں نے محققین کا کام بہت آسان بنا دیا ہے لیکن اس کے باوجود لمحہء فکر یہ ہے کہ اردو دنیا میں اس وقت جو صنف سب سے زیادہ زوال کا شکار ہے وہ تحقیق ہی ہے۔ متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں جب ہم اس زوال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو محققین کی لاپرواہی، خالص تحقیق میں عدم دلچسپی، تحقیق کے سندی مقاصد کے علاوہ اس میدان میں دلچسپی رکھنے والوں کو موزوں راہنمائی نہ ملنا ہی نمایاں وجوہات نظر آتی ہیں۔ لیکن ان سے ہٹ کر کچھ دیگر محرکات بھی ہیں جنہیں عملی سطح پر سمجھنے کی ضرورت

ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تحقیق دراصل حقائق کی تلاش کا ایک عمل ہے جس کی بنیاد فلسفیانہ تجسس پر ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تجسس گہرے مطالعے سے حبڑا ہوتا ہے۔ ایک طالب علم جیسے جیسے علم حاصل کرتا جاتا ہے نئی چیزوں کے بارے میں جاننے کی اُس کی خواہش بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک سوال کے جواب کی تلاش سے کئی نئے سوالات جنم لیتے ہیں اور ایک حقیقی محقق بعض اوقات اپنا اصل سوال چھوڑ کر اُن تمام جوابات کو تلاش کرتا ہے اور پھر اُن سب کو باہم جوڑ کر اپنا بنیادی مفروضہ قائم کرتا ہے۔ عہد حاضر میں تحقیق متذکرہ فلسفیانہ جستجو کے بجائے ترغیب کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔ ترغیب سے یہاں مراد کوئی علمی یا معاشی ترغیب ہے۔ سند کا حصول اور پیشہ وارانہ ترقی تحقیق سے منسلک کر دی گئی ہے سو اس انلاک کے نتیجے میں جو تحقیق کی کواٹلی سے زیادہ کوانٹیٹی کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اردو کے زیادہ تر محققین وہی ہیں جو اس علمی ترغیب کی بنا پر معتلات لکھ رہے ہیں۔ آزادانہ سطح پر ہونے والی تحقیق کی روایت اب دم توڑ چکی ہے۔ دوسری ترغیب معاشی مفاد ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن اور اس جیسے مختلف اداروں سے ملنے والے ریسرچ پراجیکٹ کے نتیجے میں جو تحقیق ہو رہی ہے اسے بین الاقوامی سطح پر کوئی مقبولیت ملے یا نہ ملے تاہم اس کے نتیجے میں محققین کو بڑا معاشی فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ ریسرچ پراجیکٹ دینے والے اداروں کی نیت مثبت ہونے پر کوئی شک نہیں لیکن پراجیکٹس کی تکمیل پر اُن کے نتائج کی پرکھ اور وقعت کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی تھریڈ پارٹی سسٹم موجود نہیں سو محقق کی پوری توجہ مختص دورانیے میں ریسرچ پراجیکٹ کی تکمیل پر ہوتی ہے نہ کہ اس کے معیاری ہونے پر۔ متذکرہ دونوں نوعیت کی ترغیب کی بدولت اب حالت یہ کہ تحقیق کے لیے موضوع مٹو جھتا نہیں بلکہ گھسٹا جاتا ہے۔ جہاں تحقیق کی بنیاد تفکر پر ہونی چاہیے وہاں دراصل یہ لاعلمی پر رکھی جاتی ہے۔ اردو میں تحقیق کرنے والے طلباء ڈگری میں رجسٹریشن سے پہلے مختلف اساتذہ سے اپنے لیے موضوع تحقیق طلب کرتے ہیں۔ اسی کج روی کی وجہ سے ہمارے موضوعات میں تکرار بہت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ہی موضوع پر بعض اوقات مختلف جامعات میں ایم فنل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا مرکزی ڈیٹا بیس کسی بھی سطح پر موجود نہیں جس میں پاکستان بھر کی جامعات میں ہونے والے مقالات نہ سہی لیکن کم از کم ان کے موضوعات ہی موجود ہوں تاکہ طالب علم کسی موضوع کے انتخاب کو فائنل کرنے سے پہلے اُس ڈیٹا بیس سے چیک کر سکے کہ آیا اس موضوع پر کہیں پہلے سے کام تو نہیں ہو چکا۔ حیران کن طور پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن جیسی مانیٹری باڈی نے بھی اس ضمن میں اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اردو تحقیق کی اس ابتر حالت کا نتیجہ مستقبل قریب میں یہ نظر آ رہا ہے کہ ہماری اسناد اور زیادہ بے وقعت ہو جائیں گی۔ ایک طرف ویسے ہی پاکستان میں سوشل سائنسز کو ریسرچ فنڈنگ کرنے والے ادارے مسلسل اس بنیاد پر نظر انداز کر رہے ہیں کہ آنے والا وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اس لیے ہماری تمام توجہ اور سرمایہ کاری اسی میدان میں ہونے والی تحقیق پر ہونی چاہیے اور دوسری طرف سوشل سائنسز اور ہیومنٹیز کے ڈسپلنز سے

متعلقہ شعبے خود بھی اپنی روش پر غور کرنے کو تیار نہیں۔ تحقیق میں جستجو، تفکر اور محنت تینوں فی زمانہ مفقود ہو چکی ہیں۔

متذکرہ بالا پلس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ نئے محققین پر اُردو تحقیق کی اُس روایت کو آشکار کیا جائے جو ہمارے لیے نمونے کا درجہ رکھتی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کے شعراء، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات کے تنقیدی مطالعات پر اسناد بانٹنے سے پہلے طلباء کو اس امر سے روشناس کرایا جائے کہ جیسے تنقید کے بغیر تحقیق کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اسی طرح تحقیق کے بغیر تنقید بھی با معنی نہیں بن سکتی۔ مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی ادیب، حبیب الرحمن شروانی، حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، محی الدین قادری زور، عبد القادر سروری، مالک رام، امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرام، خواجہ احمد فاروقی، گیان چند حسین، رشید حسن حنان، جمیل حالبی، خلیق انجم، مشفق خواجہ اور معین الدین عقیل کے ناموں سے ہی واقفیت کافی نہیں بلکہ طلباء کو ان کی تحقیقات کا بغور جائزہ لینے کی طرف راغب کیا جائے۔ ہم نے اُردو تحقیق کی زیوں حالی کی وجوہات میں طلباء کی عدم دلچسپی اور تحقیق کے مخصوص مقاصد سے ہٹ کر حنا لیس تحقیق کے لیے مناسب راہنمائی نہ ہونے کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ یہ راہنمائی صرف مناسب موضوع کے انتخاب میں معاونت، مسودے میں اقتباس شامل کرنے کا طریقہ اور حوالے اور حاشیے کا اندراج سکھانے تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس سب سے پہلے اُردو کے جید محققین میں سے کسی ایک محقق کے اہم ترین تحقیقی کام کے گہرے مطالعے کی طرف راغب کرنے اور اسے سمجھنے میں معاونت سے بھی متعلق ہے۔ اُردو کے جس محقق نے رشید حسین حنان یا گیان چند حسین یا جمیل حالبی صاحب کے کسی بھی ایک تحقیقی منصوبے کا بغور مطالعہ کر لیا وہ کم از کم یہ ضرور سمجھ جائے گا کہ تحقیق کے معانی کیا ہیں۔ جس محقق نے مولانا شبلی نعمانی کی "شعر العجم" دیکھی ہو اور اس کے بعد حافظ محمود شیرانی کی "تنقید شعر العجم" کا مطالعہ کیا ہو یا رشید حسن حنان کی مرتبہ "باغ و بہار"، "افسانہ عجائب"، "سحر البیان"، "گلزارِ نسیم" یا "زُمل نامہ" میں سے کسی ایک مدونہ کتاب کا مقدمہ ہی ایک دو بار بغور پڑھ لیا ہو وہ تحقیق کے میدان میں اترنے کے لیے پوری طرح تیار ہو سکتا ہے لیکن ہماری جامعہ میں رائج مسٹر سسٹم میں جہاں ہر ڈیڑھ مہینے بعد امتحان سرپر ہو وہاں طالب علم کو وقت کی کمی کا سامنا بھی حنا لیس از بحث حقیقت نہیں۔ ایسے مطالعات کے لیے واضح وقت اور فرصت کا وہ ماحول بھی ضروری ہے جو محققین کو دستیاب نہیں، انھیں ایک مخصوص دورانیے میں اپنا تحقیقی منصوبہ مکمل کر کے جمع کرانا ہوتا ہے اور اُس مخصوص دورانیے میں اُن کے لیے اپنے موضوع کے انتخاب سے لے کر متعلقہ مواد کی جمع آوری، اُس مواد کا مطالعہ، بنیادی ماخذات کے نوٹس لینا اور مقالے کی تسوید کا عمل مکمل کرنا بھی ایک چیلنج ہے۔ بہر صورت متذکرہ بالا تمام چیلنجز کو تسلیم

کرتے ہوئے بھی ہم نمونے کے طور پر چند ایسی تحقیقات کا حوالہ ضرور دینا مناسب سمجھیں گے جن کی طرف نئے محققین کو ایک نظر ضرور کرنی چاہیے۔

محمد حسین آزاد کی مشہور زمانہ تصنیف "آبِ حیات" کم و بیش تمام جامعہات کی نصاب میں شامل ہے اور یہ تصنیف مختلف سطح کے طالب علموں کو پڑھائی بھی جاتی ہے۔ اس کتاب نے اپنی اشاعت کے بعد اردو شاعری کے کلاسیکی عہد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ضمن میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ محمد حسین آزاد ایسے عالم کی تحقیقی مساعی کے علاوہ اس کتاب میں انہوں نے اپنی انشا پردازی کے جو جو ہر بکھیرے وہ آج بھی متاثر کن ہیں۔ لیکن پھر کچھ جید محققین کی تفکرانہ نظر اس کتاب کے مضمولات پر پڑھی تو انہوں نے مختلف سوالات اٹھانا شروع کیے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جن محققین نے آزاد کو آڑے ہاتھوں لیا ان میں سرفہرست حبیب الرحمن حناورانی اور قاضی عبد الودود ہیں۔ قاضی عبد الودود کا ایک عالمانہ مقالہ "محمد حسین آزاد بحیثیت محقق" 43-1942ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ ادارہ تحقیقاتِ اردو سے اس مقالے کی اشاعتِ ثانی 1984ء میں ہوئی۔ اس کے آغاز میں قاضی عبد الودود لکھتے ہیں:

"اکثریت آزاد کی نشاری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے سرمد میدان تھے۔ اقلیت مصر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے انشا پرداز ہی نہیں، ایک بڑے محقق بھی تھے۔ اس کتابچہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حق کس کی طرف ہے۔" [1]

اس کے بعد اپنے کتابچے کے اسی (80) صفحات میں انہوں نے "آبِ حیات" کی روشنی میں محمد حسین آزاد کی تحقیق کو غیر مستند ثابت کرنے کے لیے تین سونکات قائم کیے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر ہر نکتہ اپنے اندر محققانہ جستجو اور تفکر کے علاوہ مطالعے کی بے پناہ گہرائی لیے ہوئے ہے۔ قاضی عبد الودود (1896ء-1984ء) کا تعلق کاکو بہار سے تھا۔ وہ انگلستان سے معاشیات اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔ لیکن عملی زندگی میں انہوں نے اپنا ناطہ ادب اور اس میں حناورانی کی تحقیق سے جوڑا۔ مصحفی اور انشا سے لے کر محمد حسین آزاد اور مولوی عبد الحق کے ادبی کارناموں پر قاضی عبد الودود کی تحقیق نے کئی ایسے سوالات کھڑے کیے جو گو اردو دنیا کے کچھ نامیوں کی طبع پر بہت گراں گزرے لیکن انہیں جھٹلانے یا باطل ثابت کرنے کے لیے موزوں دلائل آج تک سامنے نہ آئے۔ آج کے محققین کو کم از کم "آبِ حیات" پر قائم کیے گئے تین سونکات کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ دلیل کیسے قائم کی جاتی ہے اور تحقیق میں بنیادی ماخذ اور

ثانوی ماخذ کا فرق اور اہمیت کیا ہے جسے سمجھنے میں آزاد ایسے عالم سے بھی سہو ہوا۔ "محمد حسین آزاد بحیثیت محقق" میں سے چند نکات ملاحظہ کیجیے:

3۔ ولی کا "ابتدائی عہد شاید عالم گیر کا زمانہ ہوگا" الف 92، ولی کا سالِ ولادت نامعلوم ہے مگر اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی وفات 1119ھ میں ہوئی ہے (رجوع ب ولی گجراتی مصنفہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ص 81)۔ عالم گیر 1118ھ میں فوت ہوا ہے۔ آزاد کا قول صریحاً غلط ہے۔

4۔ ولی کا سالہء نور المعرفت تصوف میں ہے، الف 93، یہ رسالہ چند سال ہوئے طبع ہو چکا ہے اور اس کا موضوع تصوف نہیں۔

5۔ دل ولی کالے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

الف 93 میں ہے کہ ولی "کبھی کبھی۔۔۔ حافظ کی طرح بادشاہ وقت کے نام سے۔۔۔ شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے۔۔۔" ولی کی وفات 1119ھ میں ہوئی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کے کسی شعر میں محمد شاہ کا نام نہیں آسکتا، اس لیے کہ اس کا سالِ جلوس 1131ھ ہے۔ شعر کا مصرع یوں ہے: "اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین" اور یہ مضمون گاہے۔ (گلشن گفتار ص 19، چمنستان شعر، ص 357)" [2]

مندرجہ بالا چار نکات پر غور کیجیے تو ب خوبی اندازہ ہوگا کہ ایک محقق کسی بھی مستن کی پرکھ کے دوران صرف ادبی ماخذات ہی نہیں بلکہ مستن کی معاصر تحقیق و تنقید اور تاریخ کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے اور پھر آزاد کے تمام بیانات کو کراس چیک کر کے ان پر رائے قائم کرتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی ولی دکنی کے بارے میں جن باتوں کو فتاحی صاحب نے رد کیا ہے بظاہر آزاد نے وہ باتیں بغیر تحقیق کے اور سنی سنائی پر یقین رکھتے ہوئے "آب حیات" میں درج کر دیں۔ ایسی ہی ایک اور بات انھوں نے مرزا مظہر حبان حباں کے بارے میں بھی لکھی جس پر فتاحی عبدالودود نے پکڑ کی ہے، ملاحظہ کیجیے:

"سودا کا ایک قطعہ الف ص 143، اور کلیات کے بعض قلمی نسخوں میں ہے، جس میں مظہر کے اشعار ریخت کی نسبت کہا گیا ہے کہ "کتا ہے دھوبی کا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا"، آزاد لکھتے ہیں کہ "نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈال رکھی تھی"۔ میرزا مظہر شاعر ہی نہیں صوفی بھی تھے اور بہستوں

کو ان سے عقیدت تھی اور ہے ایسے شخص کے متعلق ایسی بات کسی سند کے بغیر درج کتاب کرنا کسی طرح لائق ستائش نہیں۔" [3]

یہی نہیں بلکہ فتاویٰ عبد الودود نے یہ بھی اعتراض اٹھایا ہے کہ محمد حسین آزاد ان کا نام سرزا مظہر حبان حبان لکھتے ہیں کہ یہ نام انھیں عالم گیر نے دیا تھا جبکہ ان کا پیدائشی اور درست نام مظہر حبان حبان تھا، سو عالم گیر کا دیا نام آزاد ایسے عالم اور محقق کے لیے اصل اور پیدائشی نام سے زیادہ معتبر نہیں ہونا چاہیے۔ سرزا مظہر حبان حبان کے حوالے سے آزاد کے ملفوظات کی پکڑ اول مولوی حبیب الرحمن حبان شروانی اور دوم فتاویٰ عبد الودود کو کسی حد تک مہنگی بھی پڑی کہ آزاد سے عقیدت والوں نے اس امر کو ان کی شیعہ مخالفت کے زمرے میں شمار کیا۔ واضح رہے کہ مسلکی اعتبار سے فتاویٰ عبد الودود سنی تھے اور سرزا مظہر حبان حبان بھی سنی (حنفی) صوفی تھے، تاہم ان کی حسن پرستی کے قصہ گو محمد حسین آزاد کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ اغلب ہے کہ آزاد کے مدوح مسعود حسن رضوی ادیب نے اس معاملے کو زیادہ ہوا دی کہ وہ خود بھی آزاد کے ہی ہم مسلک تھے، انھوں نے ہی "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" مطبوعہ دین دیال روڈ لکھنؤ، 1953ء میں لکھا کہ:

"مذہبی تعصب کے سرریضوں کو ان بیانون میں آزاد کے تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ سرزا مظہر ایک صوفی بزرگ تھے، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ تصوف کے مسلک میں عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے مسلک میں حسن پرستی اور عاشق مسزاجی عیب نہیں ہنر ہے۔۔۔ آزاد نے سرزا مظہر کا ذکر جس احترام سے کیا ہے اس سے سوء ظن کی گنجائش باقی نہیں رہتی، مگر بد نیستی اور بدگمانی کا کیا علاج۔" [4]

یہی نہیں بلکہ انھوں نے سرزا مظہر کے نام کے حوالے سے آزاد کے بیان پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے اور طویل بحث کے بعد سرزا مظہر کی مشہور تصنیف "معلومات مظہری" کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز کہ یہ کتابوں کا سہو قلم ہے کہ حبان حبان کو حبان حبان لکھا گیا [5]۔ مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنے سو صفحات کے کتابچے میں محمد حسین آزاد اور "آب حیات" کا بھرپور انداز میں دفاع پیش کیا ہے اور بہت سی غیر مستند معلومات کو بے جا بحث سے مستند بنانے کی یوں کوشش کرتے ہیں کہ آزاد ایسے عالم کا بطور محقق مرتبہ کم نہ ہو لیکن فتاویٰ عبد الودود کی تحقیق اور دلائل کے سامنے ان کا دفاع کمزور محسوس ہوتا ہے۔ پھر فتاویٰ عبد الودود ایسے عالم پر مذہبی تعصب کا الزام بھی لگایا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند حسین لکھتے ہیں:

"اگر ادبی تحقیق کوئی دین ہوتی تو بلاشبہ متاضی عبد الودود اس کے نبی ٹھہرائے جاتے۔ ان کا مسلک سچ اور محض سچ ہوتا جو کسی ذات کی پروا کیے بغیر حقیقت کو افشا کرتے رہتے تھے، جو علاقہ کی آلائش سے ملوث نہ ہوتے تھے۔ وہ ان ارباب تحقیق کی طرح نہ تھے جو ہندو ہیں تو نسیم و چکبست کی جہہ داری ان کا دھرم ہے، جو مسلمان ہیں تو اقبال کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں، جو شیعہ ہیں تو محمد حسین آزاد کا دفاع کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ متاضی صاحب کو صرف اس سے سروکار ہوتا کہ کیا لکھا ہے، اس سے کچھ لینا دینا نہ ہوتا کہ لکھنے والے کا مرتبہ، گروہ یا مرتبہ کیا ہوتا۔ متاضی عبد الودود نے اردو تحقیق کو ایک جہت دی، ایک معیار عطا کیا۔" [6]

اردو کے میدان تحقیق کے نو واردان کو اپنے سامنے جن معیارات تحقیق کو رکھنا چاہیے ان کی ایک مثال متاضی عبد الودود ہیں۔ مختلف نقادوں کی طرح مختلف محققین بھی ایک دوسرے کی تحقیقات کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور ان پر جہاں کہیں کوئی جھول دکھائی دیتا تو سوال بھی اٹھاتے۔ متاضی عبد الودود کا اختصاص یہ ہے کہ وہ کسی کے مقام و مرتبے سے مرعوب ہوئے بغیر اور اس سے تعلق نہ رکھنے سے قطع نظر ہمیشہ درست اور صحیح بات سامنے لانے کی کوشش کرتے۔ مسعود حسین رضوی ادیب نے متاضی عبد الودود کی تحقیقات پر سوالات اٹھانے کی کوشش کی تو متاضی عبد الودود نے ان کے مرتبہ "دیوان فنائز" کو اٹھایا اور دلائل کے ساتھ مسعود حسین رضوی ادیب کے اس دعوے کو باطل قرار دیا کہ وہ نے فنائز کی زمین میں غزلیں کہیں یا وہ فنائز کے ہم عصر تھے۔ بلکہ انھوں نے فنائز کو وہی مقلد قرار دیا۔ [7] اسی طرح خواجہ احمد فاروقی ایسے عالم جن کا کام آج بھی میر تقی میر کے حوالے سے سند کا درجہ رکھتا ہے، کی کتاب "میر تقی میر: حیات اور شاعری" میں درج اس بیان کو دلائل کے ساتھ غلط قرار دیا کہ "نکات الشعراء" میں ایک سو ساٹھ شاعروں کا تذکرہ ہے، متاضی عبد الودود نے واضح کیا کہ یہ ایک سو تین شعراء کے تذکرے کو محیط ہے [8]۔ متاضی عبد الودود صاحب نے اردو تحقیق کا وہ معیار طے کر دیا کہ جس کو پہنچنا غائباً آج کے نئے محققین کے لیے بہت مشکل ہے لیکن بہر کیف اس معیار کو ذہن میں رکھ کر میدان تحقیق میں قدم رکھا جاسکتا ہے۔ یہ تو آج سے کم و بیش پون صدی پیچھے کی تحقیقات اور ان کے معیارات کی مثالیں تھیں۔ ہمارے معاصرین میں بھی کچھ ایسے محققین نظر آتے ہیں جنہوں نے واقعتاً مذکورہ معیارات تحقیق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام کیا ہے۔ ملتان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ابرار عبد السلام جو آج کل ایمرسن یونیورسٹی ملتان میں صدر شعبہ اردو ہیں، انھوں نے ڈاکٹر گیان چند حسین اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مولفہ "تاریخ ادب اردو: 1700ء تک" (پانچ جلدوں میں)، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو

دسمبر 2006ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے "حبرئل آف ریسرچ" میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ بالکل اسی طرز پر نکات و تاہم کر کے تحریر کیا گیا ہے جیسے و تاضی عبد الودود نے محمد حسین آزاد کی "آب حیات" پر لکھا۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام بحیثیت محقق ان دونوں شخصیات سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ متذکرہ مقالے کی تسوید سے پہلے انھوں نے "آب حیات" کا حواشی و تعلیقات کے ساتھ تدوین بھی کی اور یہ کتاب شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام کا متذکرہ مقالہ بھی اب الگ کتاب کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے کل 361 نکات و تاہم کیے ہیں جن میں گیان چند حسین اور سیدہ جعفر کی "تاریخ ادب اردو: 1700ء تک" کی ایسی ایسی اعلاط کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی روشنی میں یہ تاریخ ادب بالکل اسی طرح استناد کے درجے سے گرجاتی ہے جیسے و تاضی عبد الودود صاحب کے مقالے کی روشنی میں آزاد کی "آب حیات"۔ اس مقالے سے چند نکات ملاحظہ کیجئے:

"جب 728ھ / 1327ء میں محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد (دیوگیری) کو اپنا پایہ تخت بنایا تو لوگ جو درجہ جنوب کی سمت منتقل ہونے لگے۔ (جلد اول، ص 120) مذکورہ بالا بیان میں تین باتیں تشریح طلب ہیں۔ (1) 728ھ، 28-1327ء کے مطابق ہے۔ 728ھ میں دو مہینے 1327ء اور دس مہینے 1328ء کے پڑتے ہیں۔ مذکورہ بیان میں ہجری سنہ کو بنیاد بنایا گیا ہے اور یہ نہیں بتایا گیا کہ کس مہینے میں دارالحکومت کی منتقلی عمل میں آئی۔ اگر ہجری سن کے اول دو مہینوں میں یہ عمل رونما ہوا ہوتا تو سال عیسوی درست قرار پاتا ہے۔ بصورت دیگر 1328ء درست ہوگا۔ (2) رحم علی الہاشمی نے حبرئل آف ایشیاٹک سوسائٹی اور مالک الابار کے حوالے سے نشاندہی کی ہے کہ دیوگیری کا نام پہلے دولت آباد نہیں بلکہ قبۃ الاسلام رکھا گیا۔ اور دارالضرب کا یہی نام سکوں پر درج ہے (حاشیہ: دکن کے بہمنی سلاطین، ص 38) رحم علی الہاشمی نے ڈاکٹر مہدی حسن کی تصنیف "دی ریسز اینڈ فال آف محمد بن تغلق" مطبوعہ لندن کے حوالے سے یہ نشاندہی کی ہے کہ دارالسلطنت پورے طور پر دہلی سے دولت آباد منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی اور دراز کے صوبہ حبات دکن میں جو طویل فاصلہ تھا اس کے پیش نظر صرف مسلم آبادی کے عمائد کو دہلی سے منتقل کیا گیا تھا۔ اس لیے دولت آباد کو سلطنت کا دوسرا متقررہا حبا سکتا ہے۔ (حاشیہ دکن کے

بہمنی سلاطین، ص 37)۔۔۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ص 11 میں دارالسلطنت کا نام دیوگیری کی بجائے دیوگیری مرقوم ہے۔" [9]

مندرجہ بالا اقتباس میں محقق ڈاکٹر ابرار عبد السلام نے تاریخ ہندوستان اور بالخصوص تاریخ اُردو ادب کے اہم ترین واقعے شہنشاہ محمد تغلق کے دارالسلطنت کی شمال سے جنوب منتقلی کے بیان پر مختلف اہم ماخذات کی روشنی میں گیان چند حسین اور سیدہ جعفر کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ متذکرہ مورخین کے بعد بھی اُردو کے جن ادبی مورخین نے تاریخ لکھیں ان میں اسی بیان کو تسلسل سے دہرایا گیا کہ محمد تغلق کے زمانے میں دہلی پورے کا پورا دکن منتقل ہو گیا تھا، کچھ معتبر مورخین نے تو یہاں تک لکھ رکھا ہے کہ دہلی میں انسان تو کیا کوئی جانور بھی نظر نہ آتا تھا اور سب کے سب اپنے مال و اسباب کے ہمراہ دہلی سے دکن منتقل ہو گئے اور وہاں ایک نیا شہر آباد ہو گیا لیکن ڈاکٹر ابرار عبد السلام کی تحقیق نے اس بیان کو باطل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح دولت آباد کا پرانا نام دیوگیری کے بجائے اکثر مورخین نے دیوگیری لکھا ہے، بلکہ اُردو کی کسی بھی نمایاں ادبی تاریخ میں اس شہر کے پہلے مجوزہ نام "قہ الا سلام" کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام کے معیار تحقیق کے ملاحظے کے لیے چند اور مثالیں دیکھیے:

"89۔ باغ لنگم پلی عبد اللہ قطب شاہ نے تین لاکھ روپے کے مصارف سے تیار کروایا تھا۔ (اول ص 323)۔"

یہ باغ عبد اللہ قطب شاہ نے نہیں بلکہ محمد متلی قطب شاہ نے تعمیر کروایا تھا۔ عبد اللہ قطب شاہ نے بطور تفسیح گاہ کے اس کی تعمیر و آرائش پر تین لاکھ روپے صرف کیے تھے۔ باغ کی تعمیر جدید نواب سکندر جاہ بہادر مغفرت منزل نے کروائی تھی۔ 1278ھ میں نواب افضل الدولہ بہادر غفران منزل نے یہ باغ نواب سر خورشید جاہ بہادر کو دے دیا تھا۔ (دیکھیے: مآثر دکن، ص 18-19) [10]

"93۔ اور نگزیب نے کہا تھا کہ قطب شاہی فوج میں چند اور لاری ہوتے تو قلعہ گوکنڈہ کبھی فتح نہیں کیا جاسکتا تھا۔ (اول ص 365)

اور نگزیب نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر ابوالحسن کے پاس عبد الرزاق لاری جیسا ایک اور آدمی ہوتا تو شاید قلعہ کی تسخیر میں اتنا ہی عرصہ لگ جاتا۔ (دیکھیے: منتخب اللباب، حصہ سوم، ص 327، سیر المتاحرین، جلد اول، ص 369) [11]

"112- جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی۔ (اول ص 442)

عبد الغنی نے اپنی تصنیف "اے ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایرٹ دی معنل کورٹ" میں ص 31 میں راجہ کانام "بھگونت داس" لکھا ہے۔ حامد حسن قادری سے پڑھنے میں عنسلطی ہوئی۔ اسی عنسلطی کو ڈاکٹر صاحب نے دہرا دیا ہے۔ راجہ بھگوان داس علیحدہ شخصیت ہیں۔ دیکھیے: "اے ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایرٹ دی معنل کورٹ، جلد سوم، ص 474" [12]

اُردو کے تحقیق کے متذکرہ بالا نمونوں میں جن اعلیٰ معیارات کو قائم رکھا گیا ہے وہ دراصل دیگر اصنافِ ادب کی طرح تحقیق کے بھی کلاسیکی عہد کی یادگار ہیں جب محققین کے لیے ایک بڑا موضوع تاریخ ادب اُردو ہوتا۔ اُس دور میں محققین کی زیادہ توجہ شخصیات کے درست کوائف اور ان سے منسوب معلومات کی درست تسوید کی طرف رہی، اس کے بعد دوسرا اہم ترین موضوع اُردو زبان کے آغاز و ارتقار ہا جس پر بہت سے جید محققین نے قلم اٹھایا۔ ان دونوں طرح کے موضوعات پر ہونے والی تحقیقات پر بعد کے محققین نے نئے دستیاب مآخذات اور مواد کی روشنی میں اعتراضات اٹھائے جس کی ایک مثال متذکرہ بالا ڈاکٹر ابرار عبد السلام کا مضمون ہے۔ اس کے بعد اُردو تحقیق کا سفر سندی تحقیق کے دور میں داخل ہوا اور اس میں مختلف اصناف کی تخلیقات کے تجزیاتی اور تقابلی مطالعات زیادہ سامنے آئے۔ عصر حاضر تک آتے آتے تحقیق مختلف تنقیدی رجحانات، تھیوریز اور تحریکات کی روشنی میں متون کی تفہیم کے دائرے میں داخل ہو گئی۔ تحقیق کے اس سفر میں دیکھا جائے تو موضوع کا انتخاب ہمیشہ اہم ترین سرگرمی رہی اور جید محققین نے بھی مناسب موضوع کے انتخاب کو کام کی نصف تکمیل قرار دیا۔ لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ تحقیق کے طریق کار کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ معاصر عہد کے نوواردان میدان تحقیق کے لیے سب سے اہم معاملہ مواد کی دستیابی اور جمع آوری کا ہوتا ہے، عموماً وہ دیکھ کر موضوع و سائل کرتے ہیں کہ اس پر مواد کس حد تک دستیاب ہو سکے گا۔ اس رویے نے تحقیق کے معیار کو بری طرح متاثر کیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقات کرنے والے عموماً اپنے مقالات میں اقتباسات پہلے بٹھاتے ہیں اور ان پر کمسنٹری بعد میں کرتے ہیں اور لیچے متالہ تیار ہو گیا۔ تحقیقی مقالات لکھنے والے طلبہ کی بڑی تعداد وہ ہے جن کے ذہن میں مقالے کے موضوع اور تحقیقی اصولوں سے زیادہ ہمہ وقت ڈگری کی تکمیل پر حکومت کی جانب سے ملنے والا الاؤنس یا انسٹو ہوتا ہے۔ اب تو شنید ہے کہ مقالات لکھنے کا کام بھاڑے پر بھی کیا جا رہا ہے۔ اس صورتحال میں آپ اُردو تحقیق کے زوال اور محققین کی زوال آمدگی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہاں

پھر ایک دفعہ اداروں اور پالیسی ساز انتظامیہ سے کہیں زیادہ ذمہ داری اُس سپروائزر یا اُستاد پر آتی ہے جس کی نگرانی میں تحقیق کی جا رہی ہو۔ اگر اساتذہ اپنے طلباء کے سامنے کورس ورک کے دوران اور اسائنمنٹس کے ذریعے اس مضمون میں متذکرہ بلافاصلہ عبد الودود اور ڈاکٹر ابرار عبد السلام کے لکھے ہوئے مقالات رکھیں اور بتائیں کہ تحقیق کے اصل معانی سمجھیے اور ان علماء کی تحقیقات کو توجہ سے پڑھیے اور ان کی روشنی میں اپنے اذہان کو تحقیق کے لیے تیار کیجیے تو یقیناً معیاری تحقیق کے سو فیصد نہ سہی تو پچاس فیصد نمونے تو سامنے آسکتے ہیں۔ اداروں کی سطح پر علمی نشر لکھنے اور تحقیقی اسلوب سمجھانے کے لیے مناسب ورکشاپس کا وقتاً فوقتاً انعقاد بھی اس ضمن میں معاون سرگرمی ثابت ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بارے میں یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ یہ دراصل کوئی علم نہیں بلکہ مہارت ہے جس کو بنیادی توانائی علم سے ملتی ہے، علم خود سے کتابیں اور مضامین اور متعلقہ مواد پڑھ کر حاصل ہو سکتا ہے لیکن مہارت کہیں سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔

### حوالہ جات:

- [1]- فتاضی عبد الودود، محمد حسین آزاد بحیثیت محقق، (پٹنہ: ادارہ تحقیقات اُردو، 1984ء)، ص 1
- [2]- ایضاً، ص 1-2
- [3]- ایضاً، ص 4
- [4]- مسعود حسن رضوی ادیب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، دین دیال روڈ، لکھنؤ، 1953ء، ص 29-33
- [5]- ملاحظہ کیجیے: ایضاً، ص 55
- [6]- گیان چند حسین، فتاضی عبد الودود اور تنقیدِ آبِ حیات، مشمولہ: یادگار نامہ فتاضی عبد الودود، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000ء، ص 96
- [7]- ملاحظہ کیجیے: عیارستان، از: فتاضی عبد الودود، مطبع لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، 1957ء، ص 7
- [8]- ایضاً، ص 28
- [9]- ابرار عبد السلام، تاریخ ادب اُردو۔ 1700ء تک: تحقیق کے آئینے میں، مشمولہ: جبرئیل آف ریسرچ، شمارہ نمبر 10، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، 2010ء، ص 251-252
- [10]- ایضاً، ص 276
- [11]- ایضاً، ص 277

مناور نوازش

[12]۔ ایضاً، ص 284